

قرآن و سنت میں اخلاق

* □□□□□□□□ ڈاکٹر محمد عبد الحق انصاری

قرآن و سنت کی نظر میں زندگی دو مرحلوں میں منقسم ہے، مگر دونوں مرحلے ایک دوسرے کے ساتھ بے حد مربوط ہیں۔ ایک موت سے پہلے کا مرحلہ اور دوسرا موت کے بعد کا۔ بلاشبہ موت ایک عظیم تغیر ہے۔ لیکن زندگی موت پر ختم نہیں ہوتی۔ دوسری زندگی یقیناً ایک نئی زندگی ہوتی ہے لیکن پہلی زندگی کے نہ منانی ہوتی ہے اور نہ اس سے یکسر مختلف۔ دراصل زندگی ایک وحدت اور ایک تسلسل ہے۔ اس وحدت و تسلسل کا تعائنہ ہے کہ زندگی کا اخیر اعظم نہ صرف اس دنیا سے متعلق ہو اور نہ محض اُس دنیا سے بلکہ دونوں کی بھلائی پر حاوی ہو۔ قرآن مجید نے اہل ایمان کو جو تعلیم دی ہے، وہ یہ ہے :

ربنا اتنا فی الدنیا حسنة و
فی الآخرة حسنة و قنا
عذاب النار (۲:۲)

اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں بھی بھلائی
عطا فرمائیے اور آخرت میں بھی۔ اور ہم کو
آگ کے عذاب سے محفوظ رکھیے۔

اس تعلیم کا یہ تقاضہ ہے کہ دنیا کی بھلائی کو آخرت کی بھلائی کا محض ذریعہ قرار نہ دیا جائے بلکہ اس کو بذات خود مقصود سمجھا جائے۔ اسلام نے خیر کا جو تصور پیش کیا ہے، دنیا کی فلاح اس کا جزو لاینفک ہے۔ قرآن و سنت میں زندگی کے مختلف پہلوؤں (سماجی، معاشی اور سیاسی) کی تعمیر و اصلاح کا جو اہتمام ملتا ہے، وہ اس حقیقت پر شاہد ہے۔ اسلامی آئڈیل کسی ایسے فرد کا آئڈیل نہیں ہے، جو

ۛ؎ مجلہ علوم اسلامیہ (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کی جلد ۳ شمارہ ۛا سے

سماج سے الگ رہتا ہو بلکہ ایسے فرد کا ہے جو سماج کا فعال اور سرگرم کارکن ہے۔ انسان کی ذاتی زندگی اور سماجی زندگی دونوں قرآن و سنت میں ایک کُل سمجھایا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن و سنت کا تصورِ فلاح انفرادی ہی نہیں بلکہ سماجی بھی ہے۔ حیات و دنیا میں سماج کی جو اہمیت ہے، وہ تو ہے ہی، آخرت کی زندگی کا نقشہ بھی جو قرآن و سنت میں ملتا ہے، وہ بالکل انفرادی نہیں ہے بلکہ ایک طرح کی سماجی زندگی ہے لے اسلام میں جو اہمیت سماجی تعلقات، جماعتی فرائض، اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور جہاد کو حاصل ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ اسلام کا خیر کا تصور اجتماعی ہے۔ سماج سے گریز یا اجتماعی فلاح سے بے تعلقی ایک جرمِ قاتل قرار دیا گیا ہے۔ اس کی اجازت صرف ان انتہائی حالات میں دی گئی ہے جن میں دینی فرائض و ارکان کی ادائیگی ناممکن ہو جاتی ہے۔ مگر ایسے حالات میں بھی ظلم و فساد کے خلاف جہاد کو رسول اللہ ﷺ نے ہمیشہ عزیمت ہی قرار دیا ہے لے

اگرچہ دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی فی نفسہ مقصود ہے لیکن دنیا کی بھلائی کو آخرت کی بھلائی کے مقابلہ میں ترجیح حاصل ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ فلاح دنیا فی نفسہ مقصود نہیں ہے بلکہ یہ

لے قرآن مجید واضح طور پر بتاتا ہے کہ ایک خاندان کے افراد، آباء، ابناء اور ازواج جنت میں ایک ساتھ رکھے جائیں گے بشرطیکہ وہ صالح ہوں (۲۳:۱۳، ۴۰:۸، ۵۲:۲۱)۔ قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ رفقاء اور اصحاب اجتماعی طور پر رہیں گے۔ ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف کوئی بغض نہ ہوگا، ایک دوسرے کو نجات پیش کریں گے (۱۵:۵۵، ۴۷:۳۴) ان کا معاشرہ برائیوں سے پاک اور باہمی الفت اور محبت سے سرشار ہوگا (۷۸:۲۵، ۵۶:۲۵، ۲۶:۱۰، ۱۰:۱۰) چونکہ جنت کی زندگی مثالی زندگی ہوگی۔ لازم ہے کہ اس میں انسان کے سماجی حیضات کی تسکین کا موقع ہو۔ لے اس مفہوم کی حدیثیں بہت ہیں۔ یہاں صرف ایک حدیث نقل کی جاتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا کون لوگ سب سے بہتر ہیں؟ فرمایا وہ جو خدا کی راہ میں مال و جان سے جہاد کرتے ہیں۔ پھر سوال کیا گیا، ان کے بعد کون لوگ بہتر ہیں؟ فرمایا وہ لوگ جو تنہا پہاڑوں پر رہتے ہیں اور اپنے رب کی عبادت کرتے دوسری روایت میں ہے کہ اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور کسی کو نقصان نہیں پہنچاتے۔

امام نووی: ریاض الصالحین، باب استحباب العزلة عند فساد الناس والازمان، بحوالہ بخاری و

ہے کہ دنیا کی زندگی آخرت کی ابدی زندگی کے مقابلہ میں چند روزہ ہے۔ مزید یہ کہ دنیا کی زندگی دو اعتبار سے محدود ہے۔ ایک یہ کہ اس میں دین کے بہت سے حقائق کا مشاہدہ نہیں ہو سکتا، دوسرے یہ کہ اس میں اعمال کے پورے نتائج برآمد نہیں ہوتے ہیں اور نہ ہو سکتے ہیں۔ اس دو گونہ حقیقت کے نتیجہ میں دنیا کی زندگی ایک آزمائش ہے۔ چونکہ انسان کی آزمائش اس میں ہے کہ وہ زمین پر خدا کی خلافت کے فرائض انجام دے اس لئے دنیا کی بھلائی آخرت کی بھلائی کے لئے شرط لازم بن جاتی ہے۔ دنیا کی بھلائی سے نیچے اعتنائی آخرت کی فلاح کے امکانات ختم کر سکتی ہے۔

قرآن و سنت کے خیر میں جسم و روح دونوں کی رعایت ہے۔ بعد کے فکر نے جسم و روح اور مادی و روحانی خیر میں جو تضاد نمایاں کیا ہے، اس کی تائید قرآن مجید سے نہیں ہوتی جسی لذات اور روحانی مسرتیں دونوں ہی خیر کا جز ہیں۔ جسمانی لذتوں میں فی الحقیقت کوئی برائی نہیں ہے۔ دنیا فی نفسہ نہ بھلی ہے اور نہ بُری، اس کی بھلائی اور بُرائی اس طریقہ زندگی پر منحصر ہے۔ جسے انسان اختیار کرتا ہے۔ مسیحیت کا یہ تصور کہ زمین پر انسان کا ورود سقوط کے ہم معنی ہے اور گناہِ اول کی سزا ہے۔ اسلامی عقیدے کے منافی ہے۔ قرآن مجید حیات دنیا کی تعمیر و اصلاح کو سعادت کا لازمی جز قرار دیتا ہے۔ اسلام میں نہ ترک دنیا کی کوئی گنجائش ہے اور نہ ہی دنیا کی لذتوں سے بالکلیہ دست کش ہونا جائز۔ قرآن مجید نے رہبانیت کو بدعت قرار دیا ہے ﷺ اور رسول اللہ ﷺ نے اسے اسلام سے خارج قرار دیا ہے۔ ”لارہبانیۃ فی الاسلام“ ﷺ

قرآن و سنت نے جو ایڈیل پیش کیا ہے اس میں انسانی شخصیت کے کسی جز کی نفی نہیں کی گئی ہے۔ عقل و وجدان، ذوق و تخیل، جذبہ و احساس، سب کو اس کے صحیح مقام پر رکھا گیا ہے۔ اگرچہ افراد کی زندگیوں میں ان عناصر کی اضافی اہمیت گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ لیکن انفرادی حالات و صلاحیتوں کی رعایت کے باوجود اسلام نے یہ کبھی پسند نہیں کیا کہ ایک جبر کو دوسرے جز پر قربان کر دیا جائے۔ یا زندگی کے ایک پہلو کو اس قدر ابھارا جائے کہ دوسرا پہلو کچل کے رہ جائے۔ خدا کے رسول نے اس امر کی طرف خصوصی توجہ فرمائی ہے کہ آپ کے اصحاب زندگی کے کسی پہلو کو ایک خاص حد سے

زیادہ نہ دباؤں سے اسلامی آئیڈیل میں جذبہ اور عمل، فکر اور احساس، روح اور جسم کا ایک حسین امتزاج ہے۔ مثلاً کے طور پر محبت کو لیجئے اسلامی آئیڈیل میں حب الہی کو جو بلند مقام حاصل ہے وہ ظاہر ہے مگر جس محبت کی تعریف قرآن و سنت میں آئی ہے وہ نہ را جذبہ ہی نہیں ہے بلکہ وہ قوت ہے جو ان گوناگوں اعمال کی محرک ہوتی ہے جو اسلام کو پسند اور مطلوب ہیں۔

قرآن و سنت نے ہمہ جہتی شخصیت کا جو آئیڈیل پیش کیا ہے، اس میں اور مخصوص انفرادی صلاحیتوں اور رجحانات کی تکمیل میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ اسلام میں شخصیت کا ایسا بے پچک تصور نہیں ہے جس کی ہو ہو نفل ہر شخص سے مطلوب ہو حضرت ابوجہر و عمرؓ، ابوہریرہؓ و ابوذرؓ، خالد و علیؓ، عثمان ابن عفانؓ و عبدالرحمن بن عوفؓ، ابن مسعودؓ و ابن عباسؓ، عائشہؓ اور حفصہ رضی اللہ عنہم کی شخصیتوں میں اگرچہ بنیادی کیسانیت ہے لیکن اس کے باوجود ہر ایک کی قومیت اور صلاحیتیں، مشاغل و رجحانات، عادات و اطوار مختلف ہیں بلکہ بسا اوقات ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔ خدا کے رسولؐ کو انفرادی قوی اور رجحانات کی اہمیت کا بخوبی احساس تھا۔ اسی حقیقت کے پیش نظر آپؐ نے یہ فرمایا :- اَصْحَابِي كَالْجُحُومِ بَابِهِمْ اِقْتَدَبْتُمْ اِهْتَدَيْتُمْ (میرے اصحاب ستاروں کی طرح ہیں ان میں سے جس کسی کی روش تم اختیار کرو گے راہ راست پر رہو گے) افراد کو فرداً فرداً اس ارشاد کو پیش نظر رکھنا چاہیے، لیکن اگر کوئی سماج بحیثیت مجموعی کسی ایک صحابی یا ایک جماعت صحابہ کو اپنا آئیڈیل بنالے اور دوسروں سے صرف نظر کر لے تو وہ راہ راست سے ہٹ جائے گا۔ کیونکہ خدا کے رسولؐ کے علاوہ کسی کی زندگی بہر نوع جامع ہے امام نوویؒ نے اعتدال و توسط کے ذیل میں بہت سی حدیثیں پیش کی ہیں۔ ریاض الصالحین باب الاقتصاد في الطاعة۔

تھے حضرت ابوجہرؓ اور حضرت عمرؓ بڑے صائب الرائے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مختلف دینی، سیاسی اور سماجی مسائل میں ان سے مشورے کرتے تھے۔ حضرت ابوہریرہؓ اور ابوذر رضی اللہ عنہما اپنے زہد و فقر کے لئے مشہور تھے۔ حضرت علیؓ اور خالدؓ اسلام کے بہترین قائدین ہمیشہ تھے۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت عبدالرحمنؓ ابن عوفؓ اپنی ثروت اور خدمت اسلام میں فائق تھے۔ حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت ابن عباسؓ علم و تفسیر میں ممتاز تھے۔ حضرت عائشہؓ بھی دین علم و بصیرت میں مشہور تھیں۔

۷ مشکوٰۃ، باب مناقب الصحابة۔

نہیں ہے۔ سماج کو تو پوری جماعت صحابہ کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔

مسلمان کی زندگی ذمہ داری اور جواب دہی کے ایک گہرے احساس سے سرشار ہوتی ہے۔ یہ عقیدہ کہ ہر فرد کو جسم و دماغ کے ہر فعل کے لئے خدا کے سامنے جواب دہ ہونا ہے۔ اس کے شعور پر حاوی رہتا ہے جس کے نتیجے میں اس کی پوری زندگی خواہ وہ ذاتی ہو یا سماجی، ایک فریضہ بن جاتی ہے۔ مگر مسلمان اس فریضہ کو خارج سے ڈالا ہوا ایک بار نہیں سمجھتا بلکہ یہ تو اس کے داخلی احساس ذمہ داری کی ترقی یافتہ اور فعال صورت ہے۔ جو انسان کو دوسرے جانوروں سے ممتاز کرتی ہے، ناممکن ہے کہ ذمہ داری اور جواب دہی کا یہ گہرا شعور اسلام کے تصور خیر کو متاثر نہ کرے۔

خدا کے ساتھ انسان کا تعلق اگرچہ بہت وسیع ہے لیکن اس تعلق کا ایک مخصوص پہلو بھی ہے جس میں نماز اور دعا، ذکر و فکر وغیرہ اعمال شامل ہیں۔ زندگی کے آئیڈیل میں عام انسانی اخلاق کے علاوہ تعلق باللہ کا یہ مخصوص پہلو بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ انسان ابتدا میں تعلق باللہ کے مختلف طریقے اخلاقاً واجب سمجھ کر اختیار کرتا ہے مگر روحانی ترقی کی بلند منزلوں میں یہ طریقے اور اعمال تقاضائے طبیعت بن جاتے ہیں اور جواب دہی اور خوف کی جگہ ارادت و محبت لے لیتے ہیں۔

قرآن و سنت کے اخلاق کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ ان میں ہمیں اخلاق کے متعین اصول و ضوابط ملتے ہیں۔ انسان سے یہ مطلوب ہوتا ہے کہ وہ ان اصولوں کی پابندی کرے۔ بظاہر اسے اخلاق کا فقہی تصور کہا جاسکتا ہے۔ لیکن اسلامی اخلاق اس تصور سے بہت مختلف ہے۔ اسلامی اخلاق میں فرد کا محض یہ کام نہیں ہے کہ وہ قرآن و سنت کے اخلاقی احکامات حفظ کر لے اور بغیر غور و فکر کئے انہیں جوں کا توں اپنے حالات پر منطبق کر دے۔ قرآن و سنت میں عموماً جو اخلاقی اصول و ضوابط ملتے ہیں وہ بہت عام ہیں مثال کے طور پر:

اِنَّ اللّٰهَ يَاسِّرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ بے شک اللہ تعالیٰ عدل اور احسان اور اہل
وَاٰتِیَاءِ ذٰی الْقُرْبٰی وَیَنْہٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ قربت کو دینے کا حکم دیتا ہے اور فحش، منکر
وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغٰی۔ (۹۰:۱۶) اور ظلم سے منع کرتا ہے۔

اس ہدایت پر عمل کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ انسان کو مثلاً یہ معلوم ہو کہ عدل کے کیا معنی ہیں۔ اگرچہ انسان کو عدل کے مفہوم کے یقین میں قرآن و سنت سے بیش قیمت ہدایت ملے گی۔ لیکن بدلتے ہوئے

۱۴۶

حالات میں عدل کے تعاضے معلوم کرنے کے لئے ہمیشہ عز و فکر کی ضرورت پڑے گی۔ ظاہر ہے کہ یہ ضرورت زندگی کے ارتقاء اور نئے نئے حالات کے ظہور سے پڑھتی ہی چلی جائے گی۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ کسی موقع پر صحیح طرز عمل متعین کرنے کے لئے عموماً کسی ایک اصول سے منطقی استنباط کرنے کا مسئلہ نہیں ہوتا بلکہ مختلف اصولوں کے تعاضوں کو تولنا اور ان کے نتائج کو پرکھنا اور جانچنا پڑتا ہے کسی موقع پر صحیح طرز عمل متعین کرنے کے لئے نتائج اور عواقب کو ملحوظ رکھنا قرآن و سنت سے ثابت ہے۔ قرآن مجید کی یہ آیت مثلاً اس اصول کی نشان دہی کرتی ہے :

وَلَا تَجْعَلْ مِعْدَكَ مَغْلُولَةً ۖ
إِنِّي عَنقَلُكَ وَلَا تَبْسُطْهَا فِي الْبِطْ
فَقَعْدَ مَلُومًا مَحْسُورًا۔ (۲۹:۱۴) اور تہی دست ہونے کی نوبت نہ آئے۔

ایسا بھی ہوتا ہے کہ متوقع نتائج کی سنگینیت حرام کے ارتکاب کو جائز قرار دے دیتی ہے جیسا کہ بعض شدید حالات میں لحم خنزیر یا شراب کے استعمال کی اجازت دی گئی ہے یا جیسا کہ قتل ناحق کو روکنے کے لئے غلط بیانی کی یا دوسروں کو شر سے محفوظ رکھنے کے لئے فیبت کی یا روایات کی صحت معلوم کرنے کے لئے تجسس کی یا باہمی تعلقات کی اصلاح کے لئے کذب کی اجازت دی گئی ہے۔

قرآن و سنت کی نظر میں وہ عمل صائب نہیں ہے جو اس کی ہدایات کے بظاہر مطابق ہو بلکہ اس عمل کا محرک بھی صحیح ہو نامموری ہے ”انما الاحمال بالنیات“ مشہور حدیث ہے۔ وہی اعمال حقیقت میں صائب اور حسن ہیں جو خدا کی رضا کے لئے کئے جائیں لیکن اس کے ہرگز یہ معنی نہیں ہیں کہ اگر نیت درست ہو تو اعمال بھی لازماً صحیح ہوں گے۔ نیت کی صحت کے ساتھ عمل کا اخلاقی اصولوں کے مطابق ہونا ضروری ہے۔ اس دوسری شرط کی ایک شق یہ بھی ہے جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے، کہ عمل اپنے نتائج اور عواقب

شے اضطراب کی حالت میں لحم خنزیر کے استعمال کی اجازت قرآن مجید میں ہے (۱۴۶:۶) ۱۴۶:۵، ۱۴۶:۲ (۱۴۳:۲) شراب کے استعمال کی اجازت فقہ کا مشہور مسئلہ ہے۔ ناحق قتل سے بچانے کے لئے جھوٹ بولنے کی اجازت کے لئے ملاحظہ ہو امام غزالی: احیاء العلوم، دار الکتب العربیۃ الکبریٰ، مصر ۱۹۷۳: ۱۱۹ اور امام نووی: ریاض الصالحین، باب بیان ما یجوز من الکذب۔ غیبت کے جائز مواقع کے سلسلے میں ملاحظہ ہو ریاض الصالحین: باب بیان ما یباح من الغیبت۔

کے اعتبار سے صائب اور حسن ہو۔ رضائے الہی کے صحیح معنی اور عام اخلاقی محرکات سے اس کا تعلق وغیرہ ایسے سوالات ہیں جو اگرچہ قرآن و سنت کے اخلاقی نظریہ کے فہم کامل کے لئے نہایت ضروری ہیں مگر ان پر گفتگو کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔

احمال کی ذمہ داری کے بارے میں قرآن مجید کا نظریہ قابل تحقیق ہے۔ اشاعرہ کسی فعل حسن کے سلسلے میں انسان کو اس لئے ذمہ دار سمجھتے ہیں کہ شرع نے اس کے کرنے کا حکم دیا ہے۔ معتزلہ انسان کو اس لئے ذمہ دار قرار دیتے ہیں کہ یہ عقل کا حکم ہے۔ دونوں گروہوں کے نظریات ان کے مابعد الطبیعیاتی اور دینی تصورات سے اس قدر مربوط ہیں کہ آزادانہ طریقے سے اس سوال پر قرآن و سنت کا موقف متعین نہیں کیا جاسکا ہے۔ بظاہر قرآن مجید کی آیات دونوں ہی خیالات کی تائید کرتی ہیں اور غالباً صحیح نظریہ ان دونوں نظریات کا امتزاج ہوگا۔ ایسی آیات تو بے شمار ہیں، جن میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فلاں اور فلاں عمل کو واجب قرار دیا ہے۔ اور فلاں فلاں عمل اور خے کو حرام کر دیا ہے۔ دوسرے نظریہ کی تائید یہ آیت بہت واضح ہے۔ ”وَلَا اقْتَسَمَ بِالنَّفْسِ اللّٰوَمَةِ“ (۲: ۷۵) نفس لوامہ یا ضمیر کے وجود کی تصدیق سے یہ بات لازم آتی ہے کہ انسان کے اندر ایک قوت ایسی ہے جو نہ صرف شر کے ارتکاب پر طاعت کرتی ہے بلکہ خیر کا حکم بھی دیتی ہے۔ مذکورہ بالا آیت کے چند آیات کے بعد ہی یہ آیت ملتی ہے ”بَلِ الْإِنْسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ وَلَوْ أَلْقَىٰ مَعَاذِيرَهُ“ (انسان اپنے نفس پر آپ سمجھ بوجھ رکھتا ہے۔ اگرچہ وہ اپنے اوپر طرح طرح کے بہانوں کے پردے ڈال لیتا ہے)

غیرو شر صائب و غیر صائب کے علم کے بارے میں بھی قرآن مجید کا نقطہ نظر اشاعرہ اور معتزلہ کے نظریات کے درمیان معلوم ہوتا ہے۔ جس وقت کہ علم کا انحصار نہ تو محض شرع پر ہے اور نہ عقل ہی ان کے ادراک کے لئے کافی ہے۔ قرآن و سنت کی واضح تعلیمات کی موجودگی میں اشاعرہ کے اس نظریہ کی تائید کی ضرورت نہیں ہے کہ بعض حسن و قبح کا علم شرع سے ہوتا ہے۔ مگر معتزلہ کی اس رائے کے حق میں کہ بعض حسن و قبح کا علم عقل سے ہوتا ہے صرف ایک آیت پیش کی جا رہی ہے:-

وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا فَلَهُمَّهَا
فَجْورُهَا وَتَقْوَاهَا
قسم ہے (انسان کے) نفس کی کہ اسے درست بنایا اور
اس کی نیکی اور بدی الہام کر دی۔

ایک حدیث بھی اس نظریہ کی تائید میں بہت واضح ہے:-

باوابعۃ استفت قبلک واستعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے والبصر! اپنے دل سے
 نفسک البر ما اطمان الیہ القلب پوچھا کر اور اپنے نفس سے فتویٰ لیا کر نیکی وہ ہے
 واطمینت الیہ النفس والاشم جس سے دل اور نفس میں طمانیت پیدا ہو اور گناہ
 ملعالم فی صدرك وتردد فی وہ ہے جو دل میں کھٹکے اور نفس کو اُدھیر بن میں ڈال
 النفس وان افتاک الناس۔ دے۔ اگرچہ لوگ تجھے اس کا کرنا جائز ہی کیوں نہ

[مسند احمد ابن حنبل ۳: ۲۸۸] بتائیں۔

ان دونوں نظریات کی تطبیق کے لئے یہ حدیث قابل غور ہے :

ابن مسعود کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے ایک مثال بیان کی ہے۔ ایک
 راستہ سیدھا ہے اور اس کے دونوں طرف دیواریں ہیں اور دیواریں میں کھلے ہوئے دروازے ہیں، اور
 دروازوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں۔ اور راستہ کے سرے پر ایک داعی کھڑا ہوا ہے جو پکار کر کہتا ہے
 سیدھے راستے پر چلے جاؤ ادھر ادھر منہ نہ کرو۔ اور اس داعی کے علاوہ ایک اور داعی ہے جب کوئی
 بندہ ان دروازوں میں سے کوئی دروازہ کھولنا چاہتا ہے تو دوسرا داعی پکار کر کہتا ہے کہ امنوس ہے تجھ
 پر اس کو نہ کھول اگر تو اس کو کھولے گا اس کے اندر داخل ہو جائے گا۔ یہ مثال بیان کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
 اس کی تفسیر اس طرح فرمائی۔ سیدھا راستہ تو اسلام ہے اور دیواروں کے دروازوں سے مراد وہ
 چیزیں ہیں جنہیں خدا نے حرام قرار دیا ہے اور ان کے پڑوں سے مراد اللہ کے حدود ہیں اور وہ داعی جو
 راستے کے سرے پر کھڑا ہے قرآن ہے اور وہ دوسرا داعی اللہ کا واعظ ہے جو ہر مومن کے دل میں موجود
 ہے۔ [مشکوٰۃ: باب الاعتصام بالکتاب والسنتہ بحوالہ احمد، ترمذی، اور بیہقی]

انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے، اس حقیقت کی وضاحت مختلف آیات میں کی گئی ہے:

کل نفس بما کسبت رھینۃ۔ ہر شخص اپنے اعمال کے بارے میں

ماخوذ ہوگا۔ [۴۰: ۱۷]

الیوم تجزئ کل نفس بما آج ہر شخص کو اس کے کئے کا بدلہ دیا جائے گا۔ آج

کسبت لا ظلم الیوم ان اللہ کسی پر کوئی ظلم نہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب

صریح الحساب [۴۰: ۱۷] لینے والا ہے۔

انسانی ذمہ داری کے اس نظریہ کے خلاف بعض گروہوں نے قرآن مجید کی وہ آیات نقل کی ہیں جن میں خدا کی غیر محدود قدرت کا ذکر آیا ہے، مگر اس سلسلے میں دو باتیں پیش نظر رہنی چاہئیں۔ یہ خیال کہ اللہ تعالیٰ کی غیر محدود قدرت والی آیات انسانی ذمہ داری کی تائید کرنے والی آیات سے متضاد ہیں، زیادہ سے زیادہ ایک استخراجی نتیجہ ہے۔ قرآن مجید نے اعمال انسانی کی ذمہ داری کبھی اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب نہیں کی ہے۔ دوسری بات یہ کہ جب کبھی انسانوں نے اپنے اعمال بد کی ذمہ داری خدا پر ڈالی ہے اور اس کے لئے خدا کے غیر محدود علم و قدرت کا سہارا لیا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس فعل کو ظن و تخمین اور افترا ہی قرار دیا ہے۔

سَيَقُولُ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَشْرَكْنَا وَلَا آبَاؤُنَا وَلَا حَرَمْنَا مِنْ شَيْءٍ كَذَلِكَ هُتِيبُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتَّىٰ ذَاقُوا بَأْسَ قُلُوبِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ مَنْ عَلَّمَ فَتَخْرِجُوهُ لَنَا إِنْ تَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ أَنْتُمْ إِلَّا تَخْرُصُونَ۔

جن لوگوں نے شرک کا ڈھنگ اختیار کیا ہے وہ کہیں گے اگر اللہ چاہتا تو ہم اور ہمارے باپ دادا شرک نہ کرتے اور نہ کسی چیز کو (اپنی رائے) سے حرام ٹھہرتے۔ سو (دیکھو) اسی طرح ان لوگوں نے بھی (سچائی کو) جھٹلایا تھا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں یہاں تک کہ انہیں (بالآخر) ہمارے عذاب کا مزہ چکھنا پڑا (اے پیغمبر) تم کہو کہ کیا تمہارے پاس علم کی روشنی ہے جسے ہمارے سامنے پیش کر سکتے ہو؟ اصل یہ ہے کہ تم پیروی نہیں کر رہے ہو مگر وہم اور اٹکل کی اور تم اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو کہ بے سمجھے بوجھے باتیں بنانے والے ہو۔

[۱۴۹: ۶]

قرآن و سنت کے اخلاق کے یہ چند بنیادی نکات ہیں۔ رسول خدا کی زندگی اس آئیڈیل کی کامل تصویر تھی۔ آپ نے قرآن مجید کے اخلاقی اصولوں کو زندگی کے سارے شعبوں میں نافذ فرمایا۔ ذاتی زندگی ہو یا سماجی، قومی مسائل ہوں یا بین الاقوامی آپ نے ان اصولوں پر ان کی نئی تشکیل کی۔ وہ افراد جو آپ کی رہنمائی اور تربیت میں اس عظیم اخلاقی تجربے سے گزرے ان کے اندر ایک تیز اخلاقی بصیرت پیدا ہو گئی جس کو اگرچہ اپنے نظریاتی مفروضات اور مضمرات کا بخوبی شعور نہ تھا لیکن وہ ایک طویل عرصہ تک زندگی کی اسلامی تشکیل کے لئے کافی ثابت ہوئی۔